Dareecha-e-Tahqeeq
دریچۂ تحقیق
ISSN PRINT 2958-0005 ISSN Online 2790-9972
VOL 3, Issue 3
www.dareechaetahqeeq.com dareecha.tahqeeq@gmail.com

ڈاکٹر جمیل الرحمٰن

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو غازی یونیورسٹی، ڈیرہ غازی خان

ڈاکٹر عابد خورشید

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو غازی یونیورسٹی، ڈیرہ غازی خان

"خطوط جوش ملیح آبادی": تنقیدی مطالعہ

Dr. Jamil ur Rehman
Assistant Professor, Department of Urdu Ghazi University, Dera Ghazi Khan
Dr. Abid Khurshid
Assistant Professor, Department of Urdu Ghazi University, Dera Ghazi Khan

"The Letters of Josh Malih Abadi": A Critical Study

Josh Maleh Abadi is the eminent personality of Urdu literature. His contribution is matchless in the field of poetry and prose. His personality was very interesting and its shades depict through his autobiography 'Yadoon Ki Bara' at ' too. Psycho analysis of his personality shows different shades of his life. Although, he was blamed for many issues but he remained innocent and bold at the same time. This article is analytical study of his letters that were compiled by his friends Raghib Murad Abadi. These letters thorw light on his behaviour, sentiments, love affairs, scandals, grief and pleasure etc. It elaborates the behaviour of society to wards him and unfolds many knots of prevailing realities.

جوش ملیح آبادی اردو ادب کے ایسے ادیب ہیں جنھوں نے نثر اور نظم ہر دو شعبوں میں نام کمایا۔ ان کی شخصیت اور ان کے فن کا چرچا برِ صغیر کے ہندوستان، پاکستان دونوں ممالک میں رہا۔ پاکستان ہجرت کر آنے کے باوجود ان کا تعلق ہندوستان

Corresponding Author's Email: jamil_rehman@gmail.com

کے ادیبوں، سیاسی شخصیات اور دیگر سماجی حلقوں کے ساتھ تمام عمر برقرار رہا۔ فنی اور فکری سطح پر انہوں نے قاضی نذالاسلام، میر انیس، غالبؔ، نظیر اکبر آبادی، اقبال اور رابندر ناتھ ٹیگور سے اکتسابِ فیض کیا۔ ان کے شعری سرمائے میں شعلہ و شبنم، نقش و نگار، فکر و نشاط، جنون و حکمت، حرف و حکایت، عرش و فرش، رامش و رنگ، سنبل و سلاسل، سرود و خروش، سموم و صبا اور طلوعِ فکر کے مجموعے شامل ہیں جب کہ انہوں نے نثری ادب کو بھی اپنے ذہنِ رسا سے مالا مال کیا۔ شہرۂ آفاق آپ بیتی یادوں کی برات کے علاوہ ان کی خرد افروزی پہ مبنی مقالات بالترتیب 'مقالاتِ زریں' اور 'اشارات' کے نام سے شائع ہوئے۔ باغیانہ مزاج اور حسّیت کے زیر اثر ان کا قلم تمام عمر شعلے اگلتا رہا۔ وہ بغاوت چاہے مغربی استعمار کے خلاف ہو یا جہالت پر مبنی ملائیت کے خلاف اعلانِ جنگ، مذہبی تقلید ہو یا سماجی، سیاسی سطح پر برتی جانے والی منافقت، ان سب کے خلاف انہوں نے بے محابا لکھا۔ اس سے نہ صرف بند ذہنوں کو جِلا ملی اور تشکیک سے یقین تک کے سفر پہ ایقان رکھنے والوں کو ہمت اور حوصلہ ملا بلکہ سیاسی جدوجہد کرنے والے مجاہدین اور حریت پسندوں میں بھی جوشؔ کے قلم نے بجلیاں بھر دی تھیں۔ شاعرِ انقلاب کے خطاب سے متصف ہونے والے حضرت جوشؔ کی مشہور نظم 'شکستِ زنداں کا خواب' انگریزی استعمار سے لڑنے کی یاد دلاتی ہے۔ ملاحظہ ہو کہ جوشؔ کس رومان سے دورِ غلامی کے گھٹا ٹوپ سائیوں کے چھٹ جانے کا خواب دیکھتے اور غلامی میں جکڑے اسیروں کو دکھاتے ہیں:

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
آنکھوں میں گدا کی سرخی ہے، بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے، سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں
کیا ان کو خبر تھی، زیر و زبر رکھتے تھے جو روحِ ملت کو
ابلیں گے زمیں سے مار سیہ، برسیں گی فلک سے شمشیریں
کیا ان کو خبر تھی، سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں
کیا ان کو خبر تھی، ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے

اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھی دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں ا

انقلاب کے خواب دیکھنے والا جوش اپنے باغیانہ خیالات اور سوچنے کے نئے انداز بہت سوں کی طبع کے لیے ناگوار تھے اس لیے اپنوں پرائیوں نے براہِ راست یا بالواسطہ دوستی اور دشمنی کے پردے میں انہیں نشانہ تنقید بنایا۔ آزاد منش، رند مشرب اور تقلیدی روش سے باغی جوش در حقیقت انسان دوست تھا اور انسان دوستی مذہب، عقیدہ، علاقہ، زبان اور رنگ و نسل کی تحدیدات سے ماوراہوتی ہے۔ جوش کے ذہن میں انقلاب و تبدیلی کا جو نقشہ جاگزیں تھا، یہ رائے ملاحظہ ہو:

"انقلاب جوش کے لیے محض سیاسی نعرہ نہیں ہے بلکہ انسان کے جبلی حق یعنی نشاطِ زیست کا وسیلہ اور اس کی جدوجہد کا ایک محض رخ ہے۔ وطن کی آزادی کے جوش میں بھی کبھی اپنے ملک کے دوسروں ملکوں پر برتری یا دوسرے ملکوں کے استحصال کا کوئی تصور جوشؔ کے ہاں موجود نہیں بلکہ وطن کی آزادی کے خواب دیکھنے والا کبھی بھی خود کو ملکوں کی سرحد میں قید نہیں کر سکا اور اپنی شاعری اور فکر دونوں میں پوری دنیا کا باشندہ رہا۔ انسان عظیم ہے اور اسے جغرافیائی سرحدوں کی پرستش پر قربان نہیں کیا جاسکتا۔ جب جوشؔ۔ آزاد ہندوستان سے ہجرت کر کے نئے ملک پاکستان میں جابستے ہیں جو کل تک ان کے اپنے وطن کا حصّہ تھا تو اعتراض کی کمانیں تن جاتی ہیں اور نکتہ چینیوں کی پیشانیاں شکن آلود ہو جاتی ہیں حالانکہ ہوا صرف اتنا ہی ہے کہ ناقابل تقسیم انسانی جبلت کے جویا مفکر نے چند ہزار میل کی مسافت طے کی ہے اور وطنیت کی ناگزیریت کو ٹھکرا دیا ہے" ۲

اسے جوشؔ کی بدنصیبی پہ محمول کیا جاسکتا ہے کہ وطن کی عظمت اور اس کی آزادی کے سرمست ترانے گانے والے شاعر کو ہندوستان اور پاکستان دونوں سرزمینوں کے باشندوں نے اجنبیت کی نگاہوں سے دیکھا اور ان کی ذات کے علاوہ ان کا مذہب عقیدہ اور نظریے کو کفر و الحاد سے جاملایا۔ جوشؔ کے وجود کو ہندوستان اور پاکستان میں ناقابلِ برداشت قرار دیا جاتا تھا۔ خلیق انجم نے پاکستان اور بھارت کے تناظر میں یہ تجزیہ کیا:

"جوشؔ نے جب مستقل طور پر پاکستان میں سکونت اختیار کرنے کا اعلان کیا تو ہندوستان اور پاکستان میں ان کے خلاف ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ہندوستان میں جوش کو کچھ عرصہ پہلے ہندوستان کا سب سے بڑا خطاب "پدم بھوشن" ملا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو اور بعض دوسری اہم شخصیتیں جوش صاحب کا بے انتہا احترام کرتی تھیں، پھر بھی وہ پاکستان چلے گئے۔ ان کے ہجرت کرنے پر ہندوستانی اس لیے ناراض تھے کہ اس سے ہندوستان کے دو بڑے ادیبوں سیّد سلیمان ندوی اور نیاز فتح پوری کو 'پدم بھوشن' کے خطاب سے نوازا گیا تھا اور بعد میں یہ دونوں پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔ جوشؔ کے جانے کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ کچھ بھی کرو، ان کی وفاداریاں پاکستان کے ساتھ رہیں گی۔۔۔۔ اب آیئے پاکستان کی

طرف۔ یہ خبر شایع ہوتے ہی کہ جوش نے پاکستان میں سکونت اختیار کرلی۔ پاکستانی ادیب اور صحافی برچھیاں اور بھالے لے کر جوشؔ پر ٹوٹ پڑے"۔۳

جوشؔ کو فطرت اور کائنات میں چار سو پھیلا جمال اپنی جانب کھینچتا تھا۔ جمالیاتی حس اور انقلابی ذہن و دل رومانوی خوابوں کو تحریک دینے کے لیے کافی تھے۔ عمر بھر شباب اور حسن کی مشاغلیوں میں گزار دی۔ رند مشربی اور شاہد بازی کے ساتھ ساتھ علمی، ادبی دوستوں کی وسیع المشربی اور وسعت قلبی کے زعم میں تحریر و تقریر کو آزادہ روی کی راہ دکھائی۔ ان کی خود نوشت (یادوں کی برات) بھی کافی متنازعہ فیہ رہی۔ کجا ان کے خطوط کے منصہ شہود پر آنے کی وجہ سے بہت کچھ کہنے سننے کا بند نہ ہونے والا، دروازہ کھل گیا۔ جوش تو پیوندِ خاک ہو گئے لیکن ان کے خطوط اور ان کی دیگر تحریرات فردِ جرم کو تقویت بہم پہنچانے والی دستاویزات کی حیثیت اختیار کر گئیں۔ اس کا گلہ جوش کے نواسے فرخ جمال ملیح آبادی نے بھی کیا ہے۔ وہ راغب مراد آبادی کے مُرتبہ مجموعۂ خطوط کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

"بابا نے کچھ خطوط اسلام آباد سے محترم راغب مراد آبادی کو تحریر کیے اور چونکہ وہ خطوط خالصتاً نجی نوعیت کے تھے۔ جنہیں شائع نہیں کرانا چاہیے تھا مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جناب راغب صاحب نے وہ خطوط کتابی شکل میں شائع کرا دیے۔ جس نے نہ صرف قارئینِ ادب کو بلکہ بابا کی شخصیت کو بھی مجروح کیا۔ بعض ایسی باتیں بابا لکھ جاتے تھے جو اگر پبلک میں آجائیں تو آپ کے دشمن یا مخالف اس کا غلط استعمال کرتے ہوئے آپ کو پبلک میں کھڑا ہونے کے قابل نہ چھوڑیں حالانکہ ان میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہوئی۔ صرف بے احتیاطی کے باعث یہ خطوط نقصان دہ ہو سکتے ہیں"۔۴

حقیقت یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ ابھی اس نہج تک وسعتِ قلبی کے اعتبار سے بلند نہیں ہوا کہ روایتی رویّوں اور اظہار کے لگے بندھے سانچوں سے آگے بڑھ کر بات کرنے والوں کو برداشت کر سکے۔ اس المیّے کی جانب ڈاکٹر جمیل جالبی جوشؔ کی مدافعت میں لکھتے ہیں:

"ساری عمر یونہی بسر کی۔ از سر تا پا شاعر تھے۔ یہی ان کی زندگی تھی اور یہی ان کا اوڑھنا بچھونا۔ روشن دماغ بھی تھے اور وسیع القلب بھی۔ کینہ پروری سے دور اور سچائی کے اظہار میں بے باک۔ ادیب و شاعر کی ضروریات زندگی تو عام آدمی کی سی ہوتی ہیں لیکن وہ عام آدمی سے اپنے رویّے اور طرز عمل میں مختلف ہوتا ہے اور اسی وجہ سے باسی معاشرہ اس سے متصادم ہو جاتا ہے۔ جوشؔ صاحب کے ساتھ بھی یہی ہوا اور شاید جب تک یہ نظام موجود ہے ہم ادیب و شاعر کو مفلس اور مفلوک الحال دیکھ کر اسی طرح مسرور و شاداں رہیں گے"۔۵

جوش شناسی کے سلسلے میں جوش کے خطوط کو بلاشبہ اہمیت حاصل ہے۔ راغب مراد آبادی اور خلیق انجم کے مرتبہ خطوطِ جوش کے مخاطبین میں عبد الماجد دریابادی، شیخ منظور الٰہی، سجاد ظہیر، اختر حسین، مشفق خواجہ، ظفر ادیب، جدن بائی،

جمیل مظہری، کنور مہندر سنگھ بیدی، شنکر پرشاد، رام پرکاش، ساحر ہوشیار پوری، مولانا ابو الکلام آزاد، جمیل جالبی، میکش اکبر آبادی، اعجاز صدیقی، سعیدہ خاتون (صاحبزادیٔ جوش)، دیوان سنگھ مفتون، منظر صدیقی، ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی ادیب، شیخ غلام قادر گرامی، راس مسعود، خورشید علی خاں، ہلال نقوی، سیّدہ اختر، حضرت دل شاہجہاں پوری، ڈاکٹر صفدر آہ سیتاپوری، حکیم جمیل خاں، تمکین کاظمی وغیرہ کے علاوہ منور عباس، اور راغب مراد آبادی کے نام نمایاں ہیں۔ جوش کے سماجی رابطوں میں ان ناموں کے علاوہ بھی کئی نام ہیں جن کے ساتھ ان کی زندگی کے شب و روز بسر ہوئے۔ ان کی شخصیت کے جتنے پہلو اور رنگ تھے اسی اعتبار سے ان کا حلقۂ دوستاں متنوع ہوتا گیا۔ جوش نے ۸۶ سال تک بھرپور زندگی گزاری تاہم بعضوں نے ناک بھوں بھی چڑھائی اور چیں بہ جبیں بھی ہوئے لیکن وہ ان نظریات، سوچوں اور خیالات پر پختگی سے عمل پیرا رہے۔ راغب مراد آبادی انہیں ایک شاعر اور ایک انسان کے طور پر ان کے خطوں میں تلاش کرتے ہیں جس نے کبھی الوہی رتبے کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ خطوط کسی مصلح قوم، عالم دین متین، صوفی صافی، منطقی و فلسفی اور سیاست دان کے نہیں۔ اس صدی کے بلاشبہ ایک ایسے عظیم شاعر کے ہیں جس کی صرف شاعری ہی کثیر الاطراف نہیں بلکہ شخصیت قوسِ قزح کی طرح مختلف الالوان ہے۔ ''۶

جوش کے خطوط میں اس کی تنہائی بھی بولتی اور بعض جگہوں پر چیختی ہے، زندگی کے المیوں کی مجسم تصویریں، کارخانۂ قدرت کی حیرانیاں، خالقِ کائنات کی نہ سمجھ آنے والی حکمتیں اور مشیئتیں، مذہبی تنگ نظری پر طعن، شوخیاں، شرارتیں اور جملے بازیاں بے ساختہ اظہار پا گئی ہیں۔ اس نیرنگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ جوش کبھی تارکِ دنیا نہیں رہا بلکہ زندگی کے ظاہری و باطنی دنیائوں کا قدیم باسی ہے۔ وہ ایک ایسا سوچنے والا ذہن تھا جو آگہی کے کرب میں مبتلا تھا اور اس کے رفع کرنے میں کافرانہ، ملحدانہ، چھیڑ خانیوں پہ اتر آتا ہے۔ مورخہ ۲۳۔۱۱۔۷۲ کے ایک مکتوب میں بابا ذہین شاہ تاجی کو لکھتے ہیں:

''خدا کی بے پایاں ''رحمت'' نے آثار ایسے پیدا کر دیے ہیں کہ مجھ پر ان شاءاللہ آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو پرسوں دل کا دورہ ضرور پڑے گا، تنہائی میں کچھ لمحے تڑپوں گا اور پھر مر جائوں گا۔ خس کم جہاں پاک۔ کچاکچا کر آنکھیں بند کر لیں تو کچھ بھی نظر نہیں آتا، لیکن آنکھیں کھول کر دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ حیاتِ انسانی ایک عبرت ناک ٹریجڈی اور کرۂ خاکی ایک ہول ناک مقتل ہے۔۔۔۔۔ اقوال و اساطیر سے ہم تابہ کے فریب کھائیں اور تاچند اوہام آبائی کے سامنے سر جھکائیں''۔۷

جوش نے سماج میں مروج ضعیف الاعتقادی، اندھی تقلید اور منفعل روحانیت پر گہری چوٹ کی ہے کہ ان مروجہ عقائد اور روایات کے ہوتے آزادانہ سوچ کو راہ نہیں مل سکتی۔ خورشید علی خان کو کہتے ہیں:

''چالاک صوفیوں اور مجذوب شاعروں نے، قوالوں کی '' آہے وا'' اور شاعروں کی سبحان اللہ' کی وساطت سے عشق و جنوں کو ابھار اور عقل و شعور کو بھینچ کر بالعموم ایشیا اور بالخصوص ہندوستان اور پاکستان کو جذبات کی افیون پلا کر انٹا غفیل کر رکھا ہے، اس

غوطہ سے لوگوں کو جگانا، اور حکمت و منطق کی راہ پر چلانا ہمارا سب سے بڑا فریضہ ہے۔ اقوال و اساطیر نے ہماری عقل کا گلا گھونٹ رکھا ہے اور ہمارے دماغ کو ایک ایسے ڈھرے پر ڈال دیا ہے کہ ہم بے بنیاد ایقان کو اوڑھنا بچھونا بنا چکے اور عقائد کا دودھ پی پی کر تجسس ایقان و تحقیق کو ایک شیطانی عمل سمجھنے لگے ہیں، ان خرافات کے جادو گھر سے انسان کا نکلنا سب سے بڑا شرف و مجد ہے"۔۸

جوشؔ کی مبتذل نگاری پر تو سب کی نظر پڑتی ہے لیکن اس کی کلبلاتی ہوئی روح کی طرف کسی کی توجہ نہیں جاتی۔ جس سماج میں وہ سانس لے رہا تھا وہ کبھی نرے شاعر ادیب اور حساس انسان کے لیے موزوں نہیں رہا۔ واقعہ کربلا ایک تلمیح کے طور پر اس کی زندگی میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ زندگی کے شدائد کا تذکرہ دردمندی سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کاش میں، سنگ دل خورشید علی خاں ہوتا، جو اپنی چاہنے والی کو، ایک پھریری لے کر، بھلا دیتے ہیں۔ ہائے شقی ہونا، کتنی بڑی نعمت ہے۔ اے اللہ، مجھ پر کرم فرما، اور میرے سینے کو شمر کا دل عطا فرما دے۔۔۔۔۔ میں حُسینؑ ہوں، اور تمام کرۂ ارض کربلا ہے۔ پھر بھی داد دیجیے، میری سخت جانی یا بہادری کی دوستوں کے حلقے میں بیٹھ کر قہقہے مارتا ہوں، انفس و آفاق کے اسرار پر غور کرتا ہوں اور ملازمت کے دغدغے بھی سہتا ہوں۔ ہر چند زندگی تین عدد موذی میموں یعنی مسائل، معاشقے اور معاش میں گھری ہے۔ پھر بھی خوش دلی سے باز نہیں آتا اور برابر "پاپوش قلندر" کے نعرے لگاتا رہتا ہوں"۔۹

تنہائی کے لمحات اور خوش وقتی کے لیے کسی ہم سخن کی تلاش کار دشوار ہوتا ہے۔ اسلام آباد کی غیر سماجی فضا میں وہ اگلی صحبتوں کو تلاش کرتے ہیں تو منہ کی کھاتے ہیں۔ اس قحط الرجال، اور یارانِ قدح خواران کی کم یابی کا رونا روتے ہوئے جس المیے کو مضحک انداز میں بیان کیا ہے اس میں تلخی کو شدت سے محسوس کیا جا سکتا ہے، لکھتے ہیں:

"ہائے دماغی تنہائی، مارے ڈال رہی ہے مجھ کو منور صاحب ___ پنڈی میں ایک بھی سخن سنج نہیں ہے، شعر سناتا ہوں تو انتہائی داد کے طور پر بڑے بڑے پی ایچ ڈی زور زور قہقہے مارنے لگتے ہیں۔ خدا خدا کر کے کئی مہنے ہوئے ایک ایسے صاحب ملے تھے جن کی سلجھی ہوئی فلسفیانہ باتیں سن کر دل کی ڈھارس بندھی تھی کہ چلو ایک آدمی تو مل گیا ہم خیال، جو میرے دماغی سفر میں دوش بدوش چل سکے گا۔ کوئی ایک ہفتہ ہوا انہوں نے شراب کی دعوت دے کر، مجھے بڑے اصرار کے ساتھ بلایا تھا اور یہ کہ کر شعر سنانے کی استدعا کی تھی کہ یہ بادہ خواری کا نازک وقت فلسفیانہ شاعری کا بار نہیں اٹھا سکتا۔ اس وقت تو کوئی رومانی چیز سنایئے۔ اور جب ان کی استدعا قبول کر کے میں نے "عذابِ جمیل" کو سنانا شروع کیا تو یہ دیکھ کر پائوں کے نیچے سے زمین نکل گئی کہ وہ مردِ مفکر بھی پیٹ پکڑ پکڑ کر قہقہے مار رہا ہے۔ جی ہاں اس دیس میں، سب سے بڑی داد یہی ہے کہ شعر سن کر، سامع لوٹ پوٹ ہو کر رہ جائے۔ کیا بتائوں اس بدکار پیٹ نے کتنے قد آور چوتیوں کے حلقے میں بٹھا دیا ہے مجھے"۔۱۰

اس کے برعکس ان صحبتوں کو یاد کرتے ہیں جو خیال و خواب ہو چکی ہیں۔ منور عباس شہاب کو خط میں لکھتے ہیں:

"ہائے کیسی خواب و خیال ہو گئیں، ملاعنہ کی وہ صحبتیں، جب ہم سب مل کر چہچہاتے، قہقہے لگاتے، ایک دوسرے کو شعر سناتے اور ذہنی طور پر۔۔۔۔ہائے اے گنڈ مروے، کس کی نظر کھا گئی تجھ کو۔۔۔۔ آپ، سراپا ایمان کفرستان کراچی میں ہیں اور میں سراپا الحاد، اسلام آباد میں ہوں۔ اور وہ روشنی جو ایمان و الحاد کے ٹھنڈے اور گرم تاروں کی جفتی سے پیدا ہوا کرتی تھی، خاک میں مل کر رہ گئی"۔۱۱

ایک طرف حلقۂ دوستاں خزاں کے پتوں کی طرح بکھر گیا دوسری طرف جوش کی خانگی زندگی کے مسائل، بیماریاں، غربت، بے بسی اور وضعداری قائم کرنے کے لیے سر توڑ کوششیں، گھر والوں کے درمیان زمانی مکانی فاصلے پیدا کر دیتی ہیں جس کی وجہ سے وہ گذشتہ محفلیں، راز و نیاز کی باتیں کرنے والے احباب اور سامانِ دل بستگی کا چھوٹ جانا، اجنبی لوگوں اور اجنبی ماحول میں بہت کٹھن صورت حال پیدا کر دیتی ہے۔ اپنی بیٹی سعیدہ، بیٹے سجاد، اور اپنی اہلیہ اشرف جہاں کے نام جو خط لکھے گئے ہیں ان میں وہ جوشؔ سامنے آتا ہے جو ایک مخلص اور بے لوث باپ، بابا (انہیں نواسے بابا کہہ کر پکارتے تھے) اور محبت کرنے والا شوہر ہے جب کہ اہل دنیا فقط انہیں عشق و مستی اور عیش و نشاط کے خوگر کے طور پر جانتی ہے۔ رات کے ایک بجے کا عمل ہے اور وہ اپنی پیاری بیٹی سعیدہ کو بڑی دل سوزی سے لکھتے ہیں:

"غور کرو، میری ایک جان ہے اور اتنے روگ ہیں۔ میری دانش مندی مجھ کو بہلاتی رہتی ہے، ہنستا بولتا ہوں، لیکن گھن لگا ہوا ہے دل میں۔۔۔۔ جاگتے سوتے ضربیں لگتی رہتی ہیں میری جان پر۔ رئیس نے بھی مجھ سے منہ موڑ لیا۔ کاش وہ میری لاش پر روتا۔ ہائے میرا بھائی میرا محبوب بھائی مجھ سے بچھڑ گیا اور میں نامراد مرنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ میری بشاشتوں، میری سرور طلبیوں اور میرے قہقہوں سے دھوکا نہ کھاؤ بیٹی میں اندر سے اس قدر زخمی ہوں جس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ سرسبز ہوں بظاہر، باطن میں خون ہے دل" ۱۲

اپنے بیٹے سجاد کو اپنی پدرانہ محبت سے بے ساختہ پکارتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بطون میں باپ نہیں ماں بول رہی ہے۔ جو معاشرتی سطح پر جنم لینے والے المیوں میں ایک المیہ یہ بھی ہے کہ گھر مکانوں میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں اور مروت، پیار اور قربانی کا وہ گارا عنقا ہوتا جا رہا ہے۔ گھر کے تقسیم ہونے سے معاشرتی، سماجی تقسیم کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کیونکہ گھر ہی معاشرے کی بنیادی اکائی ہے۔ جوش کی یہ فریاد ہر باپ اور ہر ماں کی دلی پکار ہے، بیٹے کے نام لکھے خط کی یہ سطور قابل توجہ ہیں:

"میرے بیٹے، میرے پاس آکر رہو، میری تنہائی پر رحم کرو، جب تمھیں یاد کرتا ہوں دل سے خون کی بوندیں ٹپکتی ہیں۔ بیٹا تم! اس قدر بے رحم کیوں ہو گئے ہو کہ باپ کی معیت سے جی چراتے ہو اور کراچی میں پڑے ہوئے خود کو گھلائے ڈال رہے ہو۔ خدا کے واسطے میری پکار سنو اور میری آغوش میں آجاؤ"۔ (۱۳) (مکتوب ۷۳-۱۰-۳۱)

ازدواجی بندھن فرد اور سماج کا جزو لاینفک ہے۔ اس سلسلے میں زندگی کے ہم سفر کی تلاش کبھی محبت والفت کا روپ اختیار کر لیتی ہے اور کبھی سعادت مند اولاد اپنا یہ اختیار اپنے بزرگوں کے سپرد کر دیتی ہے کہ چندے آفتاب چندے ماہتاب بہو تلاش کرو۔ جمال و دلکشی کے ساتھ گھر گرہستی کا سلیقہ سونے پہ سہاگہ۔ ہلال نقوی جب جوشؔ سے اپنی محبوبہ کے بارے آگاہ کرتے ہیں جو جلد ان کے حجلۂ عروسی میں آنے والی ہیں وہ نہ صرف ان سے مشورہ طلب کرتے ہیں بلکہ سہرہ کہنے کی بھی فرمائش کرتے ہیں۔ جوش یہاں حکیم دانا اور سماجی رشتوں کے نازک آبگینوں کو سمجھنے والے بزرگ کے طور پر اپنے مکتوب ۲۹-۶-۷۸ میں بڑی پتے کی بات کہتے ہیں:

"سہرا کہنا تو بڑی بات ہے، مجھ سے تو یہ خط بھی لکھا نہیں جا رہا۔ خط اس طرح لکھ رہا ہوں جس طرح کمزور بینائی والا سوئی کے ناکے میں ڈورا ڈالتا ہے۔ کیسے بتاؤں کہ رسم ازدواج، محبت کا گلا گھونٹ کر رکھ دیتی ہے اور شوہر صاحب کا احساس ملکیت زوجہ کے حسن کو نگل لیتا ہے۔ ابھی تم اور نسرین، طالب و مطلوب ہو، کل شوہر و زوجہ میں تبدیل ہو جاؤ گے اور چند روز کے بعد تم دونوں کا قرب مسلسل، ہزاروں میل کا بُعد بن جائے گا جب تک شادی نہ ہو، معشوقہ محمل نشیں لیلیٰ ہوتی ہے اور شادی کے بعد وہ انگنائی میں بندھی ہوئی گائے میں تبدیل ہو کر رہ جاتی ہے "(۱۴

سماجی سطح پر کرپشن، بد عنوانی، خود غرضی، لالچ اور مفادات کا بے رحم کھیل کھیلا جاتا ہے۔ جاہ و مرتبے، اعتباریت حاصل کرنے اور حصول شہرت کے لیے اخلاقیات کا جنازہ نکال دیا جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی مدیر 'حالات' نے جوش کی اجازت کے بغیر ان کا نام سرورق پر نگران کے طور پر رقم کر دیا۔ اس پر احتجاج کرتے ہوئے محترم مدیر کو خط لکھتے ہیں:

"جناب والا۔ یہ بات میرے علم میں لائی گئی ہے کہ آپ کے اخبار "حالات" میں جس کا نام آج ہی سنا اور کبھی دیکھا ہی نہیں۔ اس کے سرورق پر میرا نام "نگران" کے طور پر شائع کیا جاتا ہے۔ حالاں کہ آپ نے کبھی مجھ سے اس امر کی اجازت طلب نہیں کی ہے۔ اس لیے گزارش ہے کہ براہ کرم اخبار سے میرا نام خارج کر کے شکریے کا موقع دیجئیے۔ نیاز مند جوشؔ) "۱۵

علمی، ادبی دنیا میں بد دیانتی کی تو کئی مثالیں ہمارے ادب میں موجود ہیں۔ ان بد دیانتوں کے پس پردہ ذاتی مفادات کا کار فرما ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن معاملاتِ عشق و محبت میں جذباتی، روحانی اور وجدانی کیفیات ہی باعثِ کشش ہوتی ہیں۔ بد قسمتی سے ہمارے معاشرے میں محبت بھی ایک کاروبار اور بیوپار بن گئی ہے۔ قحبہ خوانوں میں بیٹھی اپنے جسم کا سودا کرنے والی عورت کو تو عورت کے مقام سے نیچے گرا دیا جاتا ہے لیکن ان عورتوں کے بارے کیا کہا جائے گا جو جوشؔ جیسے پیرانہ کہن سالہ بوڑھے کو اپنی زلفوں کا اسیر کرتی ہیں اور حضرت جوشؔ اس معصومانہ خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ شاید اب بھی ان کے چہرے بشرے سے شباب کی رعنائی جھلکتی ہے کہ ایک بوڑھے پر ۲۰/ ۲۲ برس کی دوشیزہ دل و جان سے لٹو ہو رہی ہے۔ یہ بات آسانی سے ہضم ہونے والی نہیں تھی۔ اس معمے سے بھی خود جوش نے پردہ اٹھایا ہے کہ ان کی آخری محبوبہ موسوم 'بہ فتنہ آخر الزماں'

دراصل محبت میں گرفتار نہ تھی بلکہ اس کا مقصدِ وحید اپنی چند ضرورتوں کو پورا کرنا تھا جن کے لیے جوش سے بہتر شکار اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا اور وہ آسانی سے اپنا علمی، ادبی، سیاسی اثر و رسوخ استعمال کر کے اپنی محبوبہ کے دامن کو خوشیوں سے بھر سکتے تھے۔ جوش کے خط کا یہ اقتباس انفرادی اور سماجی نفسیات کو سمجھنے میں معاون ثابت ہو سکتا ہے کہ جمال آرا حسینائیں اپنا مطلب نکل چکنے کے بعد کتنی معصومیت سے گناہِ محبت سے تائب ہو جاتی ہیں۔ فتنہ آخر الزماں کا مفصل تذکرہ جوش کی آپ بیتی یادوں کی برات میں موجود ہے کہ کیونکر بوڑھے جوش پہ ڈورے ڈالتی ہے اور اپنی محبت کا اسیر کر لیتی ہے۔ یہاں جوش پر حقیقت آشکار ہو چکی ہے۔ جب آنکھ کھل چکتی ہے تو لکھتے ہیں:

"ماہر نفسیات صاحب زادی، میں یہ بات آپ کے علم میں لانا چاہتا ہوں کہ مجھ کو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ آپ مرضِ محبت سے کلیتاً شفایاب ہو کر، غسلِ صحت بھی فرما چکی ہیں اور مجھ کو اس بات کا یقین دلانا چاہتی ہیں کہ: نقشِ خیال، دل سے مٹایا نہیں ہنوز لیکن میری نگاہ نکتہ رس اس حقیقت سے آگاہ ہو چکی ہے کہ آپ کے دل میں فکرِ معاش کے علاوہ اب کوئی دوسرا جذبہ کار فرما نہیں رہا ہے۔ آپ نے اپنے مصنوعی دردِ دل کا اظہار اس بنا پر فرمایا ہے کہ مجھ سے اپنا کام نکال لیں۔ شاید آپ مجھ کو اس قدر گھٹیا اور چھچھورا آدمی سمجھتی ہیں کہ اگر آپ کے شرکِ محبت کا مجھ کو یقین ہو جائے گا تو میں آپ کی خدمت گزاری سے دست بردار ہو جائوں گا۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ میں نے جس وقت آپ کو بینک کی ملازمت دلائی تھی اس وقت بھی مجھ کو علم تھا کہ آپ محبت سے توبہ فرما چکی ہیں۔ اور اب بھی آپ کو TV میں جگہ دلا کر دم لوں گا۔ حالانکہ مجھ کو آپ کی معرفت حاصل ہو چکی ہے۔ میرا ہرگز یہ مطالبہ نہیں ہے کہ آپ مجھ کو چاہیں تو میں آپ کی خدمت بجا لائوں۔ آپ کے بدل اور یکسر بدل جانے کے تمام آثار میری نگاہوں کے سامنے ہیں یعنی:

۱۔ آپ نے مجھ کو اپنی ملازمت کی اطلاع تک نہیں دی۔

۲۔ میری بیوی کے انتقال پر تعزیت نہیں فرمائی۔

۳۔ مجھے یہ لکھا کہ جب میں آپ کو فون کرتا ہوں تو لوگ اعتراض کرتے ہیں حالانکہ باہر سے جو فون آتا ہے اس سے بینک کا بل نہیں بڑھتا۔ جب میرے فون سے بینک پر بار نہیں پڑتا اور بل مجھے ادا کرنا پڑتا ہے تو پھر اعتراض کس بات کا؟ شاید کوئی رقیب یا کئی رقیب ہوں جن کو میرا فون کرنا زہر لگتا ہے۔

۴۔ آپ نے مجھ سے یہ کبھی نہیں کہا کہ میں لاہور آئوں، آپ چھپ کر میرے پاس آجائیں گی۔

۵۔ پہلے جب میں رخصت ہوتا تھا، نام خدا، آپ کی ہچکیاں بندھ جایا کرتی تھی لیکن اس بار آپ نے مجھ کو قہقہوں کی گونج میں رخصت فرمایا۔

۶۔ اسٹیشن پر ملنے آئیں تو مجھے موقع نہ دینے کے واسطے، ایک عدد سہیلی کو بھی ساتھ لیتی آئیں۔

۷۔ میں نے درخواست کی ساہیوال تک چلنے کی، آپ یہ سنتے ہی میرے کمپارٹ منٹ سے بھاگ کر پلیٹ فارم پر کھڑی ہو گئیں۔

۸۔ میں نے آپ کی خدمت میں اپنا کلام بھیجنے کی درخواست کی، آپ نے کلام نہیں بھیجا جب دل کو ہو آرام۔۔۔تو کیسی تخلیقِ کلام

۹۔ گو گا مجھ سے نہیں ملی، آپ کا خط مع درخواست، عابد کے ہاتھ بھیج دیا، شاید یہ بھی آپ کی ہدایت ہو۔

۱۰۔ آپ نے مجھے پورے ایک سال سے خط نہیں لکھا۔ خود نہ سہی، کسی سہیلی سے لکھا کر بھیج دیتیں مگر آپ نے اس کی قطعی پروا نہیں کی۔

۱۱۔ جب میں نے لاہور اسٹیشن پر گلے ملنے کی بھیک مانگی آپ کے روئے رنگیں پر کراہت کے خط دوڑ گئے۔ مروت و مصلحت کے دبائو میں گلے ملیں لیکن اس قربت میں کس قدر عبرت ناک فاصلے تھے، اسے میرا ہی جی جانتا ہے۔ آپ کا مصلحت نامہ واپس کر رہا ہوں، میں اسے چاک کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا، آپ پھاڑ دیں۔ اور میری اس مبنی بر راست گفتاری تحریر کو، ایڑیوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کسی گندے نالے میں پھینک دیں۔ وادریغا کہ میں اب تک نہیں بدلا ہوں اور آخری ہچکی تک بدل نہیں سکوں گا لیکن آپ کی جوتی سے۔

قالبِ سنگ میں ڈھل جائو گی معلوم نہ تھا

اس قدر جلد بدل جائو گی معلوم نہ تھا

یایوں کہیے،

راندہ فریب بارگاہ آخر الزماں)"۱۶

حد ہے کہ فتنہء آخر الزماں کی بڑی بہن بھی جوش پہ ریجھی ہوئی تھی یا پھر جوشؔ کی نگاہ التفات اسے بھی محروم نہ کرنا چاہتی تھی۔ جوش کے نزدیک جہل گزیدہ اور وہم پروردہ معاشرے میں محبت کرنا تو نا قابلِ معافی جرم سمجھا جاتا ہے لیکن قتل و غارت کرنے کو بہادری اور شجاعت سے تعبیر کی جاتا ہے۔(۱۷) جوش کے ہاں نظریہء خیر و شر رائج نظریات سے کسی قدر مختلف ہے۔ ادیبوں اور ہم عصروں کی معاصرانہ چشمک کو بھی اس سماج اور کون و مکان کا حصہ سمجھتے ہیں۔ ادبی چیر پھاڑ کا عمل ادیبوں کے ہاں کچھ زیادہ ہی ملتا ہے۔ بالکل ویسا ہی جیسے دیگر بندگانِ خدا بغض، حسد اور ذاتی پسند و پسند کی بنا پر کرتے ہیں۔ مولانا عبد الماجد دریابادی کو نیاز فتح پوری کے حوالے سے خط میں رقم طراز ہیں:

"جی ہاں، نیاز صاحب 'دریابادی' کو 'بے نقاب' کر چکنے کے بعد اب 'ملیح آبادی' کے 'بے نقاب' فرمانے میں مصروف ہیں لیکن اس کی پرواہ نہ کیجیے۔ اس دنیا کی رونق اور اس کارخانۂ عالم کی چہل پہل انہیں ہنگاموں سے ہے۔ "بدمعاش" کا وجود اس کرۂ

ارضی کی تابانی ور گرمیِ بازار کے لیے اشد ضرورت ہے۔ اگر دنیا میں بد معاشی نہ رہے تو اس محفل کا سناٹا ناقابلِ برداشت ہو جائے۔)"۱۸

معاشرتی فضا میں قدامت اور جدیدیت کے قطبین ہونے کی وجہ سے اس کے حق میں اور اس کے خلاف افراد منقسم ہو جاتے ہیں اور جب ان میں شدت آتی ہے تو اچھے خاصے پڑھے لکھے اور روشن فکر والے بھی اسی ذہنی تنگ دامنی کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ جوش اپنے 'مجلّہ کلیم' کے لیے عبد الماجد دریابادی سے کچھ تحریریں مانگتے ہیں لیکن جوش کی آزادہ روی اور آزاد خیالی کے پیشِ نظر معذوریت کا اظہار کرتے ہیں تو جواباً جوش کا یہ مکتوب ملاحظہ ہو جس میں ایک طنز بھی ہے اور چھپا ہوا احتجاج بھی!

"ماجد میاں! اب میں سمجھا کہ آپ نے 'کلیم' کے ساتھ اس قدر بے اعتنائی کیوں روا رکھی، آپ کے انتقاد کا لب و لہجہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ آپ کا تصوف مجھ سے نہایت برافروختہ ہے اور آپ کی قدامت پسندی کے ماتھے پر شکنیں پڑی ہوئی ہیں۔ جی ہاں! میں ایک اچھا ادیب بن سکتا ہوں اگر "راہِ نجات" کی تفسیر شائع کروں اور "نور ناموں" پر مضامین لکھوں۔ واہ رے ہندوستان! بد قسمت ہندوستان!! کاش آپ کو یہ غور کرنے کا موقع ملے کہ کسی معاملے میں حدود سے متجاوز ہونا کس قدر ہولناک صورتِ حال ہے (مکتوب ۱۸۔۳۔۳۶ص ۶۸)۱۹

جوش کا ملامتی صوفیوں جیسا اظہار ہی ان کا دشمن نکلا اور وہ جواب، جواب الجواب کے چکر میں گھن چکر بنے رہے۔ ایک جوش پر ہی بس نہیں بند معاشرے میں تازگی لیے فکر کی کوئی قدر و منزلت نہیں، الٹا سماج کے نام نہاد مصلحین لٹھ لے کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اپنی اس محرومی اور بد بختی کا رونا ان الفاظ میں روتے ہیں:

"میری یہ بڑی بد بختی ہے اور اس بد بختی پر میں اپنی عناصر ترکیبی کا شکر گزار ہوں کہ جس بات کو اپنے نزدیک حق سمجھتا ہوں اس کا دھڑلے کے ساتھ، زبان و قلم سے اعلان کر دیتا ہوں اور اسی پیدائشی عادت کی بناء پر ہندوپاک، دونوں ملکوں میں، وہ ہوں جس کو مغضوب، مبغوض، مقہور، معتوب اور مردود کہا جاتا ہے۔ میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا، یا بالفاظ دیگر میری یہ مجال نہیں کہ میں اس قدر مہمل دعویٰ کروں کہ جو کچھ میں نے سمجھا، بُوجھا یا سوچا ہے، وہی حق ہے اور اایسا حق کہ اسے باطل قرار ہی نہیں دیا جا سکتا لیکن میں بے پایاں دیانت کے ساتھ یہ دعویٰ ضرور کر سکتا ہوں کہ میری نیت (برقرار) ہے اور میرے نفس کی طہارت پر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا لیکن لوگ سطح بیں ہونے کے باعث میری نیت پر نگاہ نہیں کرتے اور میرے الفاظ کی سختی و شوخی پر (جواب بہت کم ہو چکی ہے) نگاہ کر کے مجھ پر سب و شتم کرنے لگتے ہیں۔

"مجھ کو انعام حق پناہی دے گا
میری نیت کو تاج شاہی دے گا) "۲۰

سختیِ دوراں دیکھیے کہ خوش طبع، خوش وضع اور خوش گفتار جوش اپنی معنوی اولاد یعنی قلمی مسودوں کو اپنے پیٹ کی بھوک مٹانے اور دوسری معمولی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بیچنا قبول کر رہے ہیں۔ معاشرہ زندہ ادیبوں کی وہ توقیر نہیں کرتا جتنا ان کے مرنے کے بعد ادبی سیمیناروں، یادگاروں اور تحسینی مقالات کی شکل میں خراجِ تحسین پیش کرتا ہے۔ اس تضاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شیخ منظور الٰہی کو لکھتے ہیں:

"بندہ نواز، گرامی نامے اور مسودات کے سلسلے میں، کرم فرمائی کا رسمی نہیں دلی شکریہ قبول فرمائیے۔ جی ہاں، میں جانتا ہوں کہ میری ناکام زندگی، ان مسودوں کو فروخت کر رہی ہے اور اسی بناء پر حقیر معاوضہ ملے گا، اگر میری مبارک موت ان کو فروخت کرتی تو منھ مانگے دام پاتی۔ لیکن جب زمانے کی ناقدر دانی اپنے اس دورِ واپسیں کی سوختہ سامانی اوران ذہنی تعصبات پر نگاہ کرتا ہوں جو میری ذات سے وابستہ ہیں تو آپ کی پیدا کردہ یہ سہارا بھی بہت غنیمت معلوم ہوتا ہے اور بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ آپ کا شکریہ ادا کروں۔۔۔۔۔۔ اب رہا یہ امر کہ میں جیتے جی، اپنے کو مرحوم کیوں لکھتا ہوں، سو یہ داستان بڑی دردناک ہے"۔ ۲۱(

اظہارِ غم کے کتنے ہی قرینے ہیں جنھیں جوش نے اپنی تحریرات اور خطوط میں برتے ہیں۔ براہِ راست غم کے اظہار سے لے کر فلک پر کو چیلنج کرنے کے انداز میں ہمت اور حوصلگی کے نہ ختم ہونے والے جذبے کے اظہار میں بھی وہ بیچارگی جھلکی پڑتی ہے۔ یہ کہنا کہ ہم لَاتَحزَنُو کے دائرے میں ہیں اور تمام علائقِ دنیا کو گرد کی طرح جھاڑتے رہتے ہیں کا دعویٰ محض دعویٰ ہی ہے۔ جمیل مظہری حوصلہ دینے کی شکل میں اپنی کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس لیے اے میرے دبلے پتلے نازک اندام مفکر دوست، جوتی کی نوک پر مارو انتشارِ والم کو، پھریری لو، اٹھ کھڑے ہو اور سیدھے ہاتھ کی مٹھی کو زور سے بند کر کے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائو اور ہات کو شہدوں کی طرح ہلا ہلا کر قہقہے مارو اور پکار پکار کر کہو"اس پر مارتا ہوں آلام کو" جب"اس پر مارتا ہوں" کہو تو گردن ذرا اسفل کی جانب جھکالو تا کہ آسمانِ کج رفتار یہ دیکھ لے کہ تم آلام کو کس پر مار رہے ہو")۲۲

اسے تقاضائے فطری اور حالات کا جبر کہیے کہ جوش کو اپنے لیے، اپنے خاندان کیلئے اور سب سے بڑھ کر اپنے متعلقین احباب کے لیے دستِ سوال دراز کرنا پڑتا تھا۔ جوش پر انتقاد کرنے والوں نے ان کی سفارش طلبی کو انتہائی خود غرضی اور منافیٔ خود داری قرار دیا ہے لیکن اس حقیقت کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ وہ آخر کیا کرتے اگر اپنے کرم فرمائوں سے استناعت طلب نہ کرتے؟ شنکر پرشاد کو خط میں اپنے بیٹے کے لیے پرمٹ کے حصول بارے غیر معمولی تاخیر پر لکھتے ہیں:

”آپ نے ہونہ ہو، شاید دل ہی دل میں یہ امر طے فرمالیا ہے کہ جس روز میں انتقال فرماجاؤں گا اس کے عین تیسرے دن آپ میرے یتیم بیٹے کو پرمٹ دے کر اس کے غم اور نقصان کی تلافی کر دیں گے۔ بہت اچھا، اگر یہی مرضی ہے سر دار کی، تو یہ بندۂ ناچیز اور یہ آپ کا چاہنے والا رندِ خراباتی ایڑی چوٹی کا زور لگا دے گا۔ اس امر میں کہ جلد سے جلد انتقال فرماجائے۔

کہا جو جینے کو، جی اٹھے ہم، کہا جو مرنے کو مر گئے ہم

اب اور کیا چاہتا ہے ظالم ترے اشاروں پہ چل رہے ہیں) ۲۳

یہ تو رہی بات عرض مدعا کی، دوسری جانب وہ اپنے کرم فرما کو اکراہِ تامہ کا شکار بھی نہیں کرنا چاہتے۔ ہر حال میں اپنے مطلب کے حصول کو اپنے لیے بھی اور دوسرے کے لیے بھی تکلیف دہ سمجھتے ہیں۔ شنکر پر شاد (جو اس وقت کمشنر تھے) کو کہتے ہیں:

”البتہ ایک بات کہہ دوں اور وہ یہ ہے کہ اگر میری امداد سے آپ کی پوزیشن پر کوئی حرف آتا ہو تو میں آپ سے اپنے سر کی قسم دے کر یہ کہتا ہوں کہ ہر گز ہر گز میری امداد نہ کیجیے گا۔ اس لیے کہ آپ کی پوزیشن کو میں اپنی جان کے برابر سمجھتا ہوں“۲۴

اسی سفارش طلبی پر ڈاکٹر جمیل جالبی نے جوشؔ کی زبانی لطیفہ نقل کیا ہے:

”جوش صاحب بہت بھلکڑ ہیں۔ ذرا سی دیر میں بات بھول جاتے ہیں اور تو اور اپنے اشعار تک بھول جاتے ہیں۔ اکثر میں نے ان کا شعر پڑھا، کہنے لگے:

جمیل صاحب! یاد نہیں ہے کہ میرا ہے۔ ویسے معلوم میرا ہی ہوتا ہے۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ کوئی سفارش میں پکڑ لایا۔ جب میرے پاس آئے تو کہنے لگے کہ بھئی اتنا تو یاد ہے کہ سفارش کرنی ہے اور ان صاحب کی کرنی ہے لیکن یہ بھول گیا ہوں کہ کیا سفارش کرنی ہے ”ویسے یہ جملہ کہتے وقت وہ مجسم سفارش بنے ہوئے تھے“ ۲۵

ایک طرف زندگی کی قہرمانیاں تھیں، دوسری طرف مجبوریوں میں گرفتار آرزوئیں، نجات کی صرف ایک صورت موت تھی۔ انہیں سیماب اکبر آبادی کی موت کا دکھ تھا تو اپنے زندہ رہنے کا افسوس۔ منظر صدیقی کے نام یہ تعزیتی خط ملاحظہ ہو:

دہلی، دسمبر ۱۹۵۱ء

منظر صاحب!

یہ تعزیتی خط نہیں بلکہ وہ خون کی بوند ہے جو آپ کے محترم والد، ملک کے گراں قدر شاعر اور اپنے دیرینہ دوست علامہ حضرت سیماب کی وفات پر دل سے بے اختیار ٹپک پڑی ہے۔ یہ میرا کم بخت دل جو پرانے دشمن کی موت پر بھی دھڑک سکتا ہے۔ اپنے پرانے دوست کی موت پر کیوں کر صبر کر سکتا ہے؟ میں اس عظیم سانحہ پر جب خود آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا، آپ کو تلقینِ

صبر کیوں کر سکتا ہوں۔ روییۓ اور جی بھر کر روییۓ کہ رونا ہی زندگی کا عنوان، آغاز اور انجام ہے۔ دیکھیں سفاک موت آدمی کے ساتھ کب تک یہ کھیل کھیلے گی اور نہ جانے وہ زمانہ کب آئے گا جب انسان خود موت کا گلا گھونٹ دے گا۔ ۱۹۵۰ء کا آخری اور ۱۹۵۱ء ابتدائی حصہ اردو ادب کے واسطے کتنا منحوس ثابت ہوا، کتنی شمعیں اس دور میں گل ہو گئیں۔ موت نے کس قدر جلد جلد اربابِ کمال کو پکارا۔ بھائی اب جوش بھی گوش بر آواز ہے۔ ایک ایک کر کے لوگ اٹھتے چلے جا رہے ہیں۔ اب جی کر کیا کروں گا۔ تنہائی کے شدائد نے بد حواس کر رکھا ہے۔ مرنے والوں کی آوازیں بلا رہی ہیں۔

یاں چمپئی دھوپ ہے، گلابی سایا

رہتا ہے سحابِ ابدیّت چھایا

جوشؔ آؤ کہ منتظر ہے بزمِ ارواح

آیا، یارانِ رفتہ آیا، آیا سوگوار جوشؔ ۲۶

یاران رفتہ کے بلانے پر وہ کب کے رکنے والے تھے۔ بالآخر ۲۲ فروری ۱۹۸۲ء کو اپنے خالق سے جا ملے جسے وہ عمر بھر تلاش کرتے رہے۔ اس تلاش کے شاہد ان کے نواسے فرخ جمال ملیح آبادی ہیں۔ وہ اپنی یادوں کے ورق الٹتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اکثر صبح کو جب ہم بیدار ہوتے تو دیکھتے کہ بابا کسی گہری سوچ میں غرق ہیں۔ ایک دفعہ صبح سویرے ایسا ہی ہوا کہ کمرے میں اگر بتی جل رہی ہے اور وہ ماتھے پر ہاتھ رکھے کچھ سوچ رہے ہیں۔ میں قریب گیا تو دیکھا کہ آنکھوں میں آنسو ہیں۔ میں نے پوچھا : بابا کیا ہوا؟ جواب دیا بڑی دیر سے اپنے خدا کو تلاش کر رہا ہوں لیکن نہیں ملتا“۔ ۲۷

جوش کی وفات پر مشکو حسین یاد نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

”آج کا دور بزدلی اور کم ہمتی کا دور ہے۔ جوش اپنی تمام دنیاداری کے باوجود ایک بے باک حق جو اور باکمال شاعر و ادیب تھے“۔ ۲۸

تمھیں آہیں سننے کا شوق تھا مگر اب بتاؤ کرو گے کیا؟

جو کراہتا تھا تمام شب وہ غریب جوشؔ تو مر گیا

حوالہ جات

۱۔ فرخ جمال، ملیح آبادی، جوش: میرے بابا، پورب اکادمی اسلام آباد، طبع اول ۲۰۱۰، ص ۱۸۵

۲۔ قمر رئیس (مرتب)، ترقی پسند ادب کے معمار، سٹی بک پوائنٹ کراچی، ص ۲۰۳

۳۔ خلیق انجم (مرتب)، جوش کے خطوط، نگارشات پبلشرز لاہور، ص ۱۱۔۱۲

۴۔ جوش میرے بابا، ص ۱۱۵

۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، معاصرِ ادب، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۱ء ص ۲۰۲

۶۔ راغب مراد آبادی (مرتب)، خطوط جوش ملیح آبادی، ویلکم بک پورٹ لمیٹڈ کراچی ص ۲۱

۷۔ ایضاً ص ۲۹

۸۔ ایضاً ص ۴۵

۹۔ ایضاً ص ۵۱

۱۰۔ ایضاً ص ۱۰۴

۱۱۔ ایضاً ص ۱۰۶

۱۲۔ ایضاً ص ۱۰۹

۱۳۔ ایضاً ص ۱۱۰

۱۴۔ ایضاً ص ۱۱۴

۱۵۔ ایضاً ص ۱۳۵۔۱۳۶

۱۶۔ ایضاً ص ۱۴۸۔۱۵۰

۱۷۔ جوش کے خطوط، ص ۴۳

۱۸۔ ایضاً ص ۶۰۔۶۱

۱۹۔ ایضاً ص ۶۸

۲۰۔ ایضاً ص ۷۵

۲۱۔ ایضاً ص ۷۹۔۸۰

۲۲۔ ایضاً ص۸۷۔۸۸

۲۳ ۔ ایضاً ص۱۰۴

۲۴ ۔ ایضاً ص۱۱۱

۲۵ ۔ ایضاً ص۲۱۱

۲۶ ۔ ایضاً ص۱۳۷۔۱۳۸

۲۷ ۔ جوش: میرے بابا ص۹۰

۲۸ ۔ حسن رضوی، ڈاکٹر، (مرتب)، خیالات، گورا پبلشرز لاہور ۱۹۹۶، ص۲۰